SALEEM LIBRARY
I/S Sher ·nwala Gare,
Line Subhan Khan Lahore.

اسی لیے غالبؔ اسے نقشِ پائے رہرو کہتا ہے اور یہ نقشِ پا بھی ویسا ہی ہے ۔ جس کے لیے مومن کہ گیا ہے ؎

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

لیکن سنگ و خشت کا کعبہ سفرِ الی اللہ میں منزلِ مقصود نہیں ایک متبرک اور قابلِ احترام یادگار ہے ۔ بقولِ غالبؔ ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

کعبہ خدا کی طرف جانے والے کی ایک منزلِ سرِراہ ہے ۔ اگر کوئی کعبے میں پہنچ کر سمجھے کہ میں خدا کے گھر تک پہنچ گیا تو یہ اس کی نافہمی ہوگی ۔ خدا کسی مکان کا مکین نہیں ۔ دنیا میں ہر گھر خدا ہی کا گھر ہے ۔ سنگ و خشت کے کعبے کے مقابلے میں تو انسان کے دل ہی کی بدرجہا زیادہ قیمت ہے ۔ ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہِ خلیل آزر است
دل گزرگاہِ جلیل اکبر است

خدا کی طرف سفر کرنے اور انسانوں کو اسی طرف لے جانے والے رہبر دنیا میں اپنے آثار چھوڑتے گئے ہیں ۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اثر منزلِ مقصود نہیں راہِ سلوک کے تیز قدم راہرو صورت سے معنیٰ کی طرف اور ظاہر سے باطن کی جانب سفر کرتے ہیں ۔ اور ساری نوعِ انسان کدھر سے کدھر جا رہی ہے ۔ اس کا تصوّر محال ہے ۔

SALEEM LIBRARY
I/S Sher ·nwala Gare,
Line Subhan Khan Lahore.

؎ کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
این قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید (حافظ)

ارتقا کوش برگزیدہ ہستیوں کے آثار حکمت آموز اور بصیرت افروز ہیں لیکن انسانی زندگی کا آئین یہی ہونا چاہیے کہ " درسلوک از ہرچہ پیش آمد گذشتن داشتم " ، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ روحانی ترقی میں جلد آگے نہیں بڑھ سکتے ۔ وہ پہلے پیشوایانِ دین کے آثار پر رک جاتے ہیں ان کے لیے مناسب بھی یہی ہوتا ہے ۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے

؎ کعبہ را ویراں مکن اے عشق کایں جا یک نفس
گہ گہے پس ماندگانِ راہ منزل می کنند

لیکن جب کوئی مدت دیر تک ظواہر پر اٹک جائے تو اس کا روحانی تنزل شروع ہو جاتا ہے ۔ فیضیؔ بھی غالبؔ کی طرح کعبے سے مراد ظواہرِ دین لیتا ہے ۔ اس کے زمانے میں علماء سوء نے دنیا طلبی اور خود غرضی کا محشر بپا کر رکھا تھا ۔ ان کی شریعت کی ظاہری پابندی اور باطن کے کھوکھلا پن سے بیزار ہو کر کہتا ہے ۔

؎ بیا کہ روئے بہ محرابِ گاہِ نور نہیم
بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم
حطیم کعبہ شکست و بنائے قبلہ بریخت
بیا کہ طرحِ یکے قصر بے قصور نہیم

(میں نے یہ اشعار علامہ اقبالؔ کو سنائے تو وہ بے حد متاثر ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد فرمانے لگے کہ وہ اشعار میرے اندر گونج رہے ہیں ۔ شاید میرے اندر سے بھی کچھ نکلوائیں گے)

؎ شادم کہ بر انکارِ من شیخ و برہمن گشتہ جمع
کز اختلافِ کفر و دیں خود خاطرِ من گشتہ جمع

شیخ اور برہمن اپنے عقائد اور مسلک الگ الگ رکھتے ہیں۔ نہ یہ کبھی اسے صحیح سمجھ سکتا ہے اور نہ وہ اس کا حق پر ہونا تسلیم کرتا ہے۔ مذاہب کے اس اختلاف اور پرخاش سے صلح جو اور آزاد خیال مفکر بہت پریشان ہوتا ہے۔ ادیان میں اتفاق کے بجائے اختلاف پر زور دینے سے انسانوں میں رواداری پیدا نہیں ہو سکتی۔ غالبؔ کہتا ہے کہ میری دلجمعی میں بھی اس سے بہت خلل آتا تھا۔ لیکن میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ کم از کم میرے انکار پر تو یہ دونوں متفق ہو گئے ہیں۔ اگر میرے انکار ہی پر یہ ہم نوا ہو جائیں تو بھی ایک کامیابی ہے کہ کسی بات نے تو ان ازلی متخاصمین کو ہم آہنگ کر دیا۔ شیخ بھی میرا مخالف ہے اور برہمن بھی اس کے وجوہ مختلف سہی لیکن ایک ہی شخص کے دو دشمن آپس میں کسی انداز کی دوستی پیدا کر لیتے ہیں۔ موافقت تھوڑی بھی ہو تو اچھی چیز ہے اس سے ان دونوں کو کچھ فائدہ پہنچے گا۔ لیکن خود مجھ میں بھی اس سے جمعیت خاطر پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ میں ان کے اختلاف سے بہت پریشان رہتا تھا۔ وہ پریشانی ان کے اتفاق سے رفع ہو گئی ہے۔ زمانۂ حال کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے۔ الحادی اشتراکیت کو مسلمان عیسائی یدھ مت والے اور دوہری ہندو سب اپنے لیے شدید خطرے کا باعث سمجھتے ہیں۔ خاص کر مسلمان اور عیسائی جو چودہ سو برس سے برسرِ پیکار رہے زبان و قلم و شمشیر سے ان کی جنگ آزمائی کو کوئی قوت نہ مٹا سکی۔ لیکن اب یورپ اور امریکہ میں کئی ادارے اور مجلسیں قائم ہو رہی ہیں جن کا مقصود اسلام اور عیسائیت کی مخاصمت کو حتی المقدور مٹانا ہے۔ حال ہی میں بمقام لبنان ایک عظیم الشان مجلس منعقد کی گئی۔ جس کا محرک ایک امریکی ادارہ تھا۔ اس ادارے میں ایسے مشنری بھی شریک تھے جن کا دیہ اسلام کے متعلق اس سے قبل معاندانہ ہی تھا لیکن کوئی چالیس مسلمان علماء و قائدین اور اتنے ہی عیسائی علماء و قائدین اس غرض سے جمع کیے گئے کہ وہ اپنے اختلافات نظر انداز کر کے ادیان کے متفقہ اصول کی بنا پر الحادی

اشتراکیت کے خلاف ایک محاذ قائم کریں ہر ایک دینی اقدار اور معاشرت میں ان کے اطلاق کو اپنے دین کے نقطۂ نظر سے پیش کرے اور دوسرے دین کے متعلق کوئی دل آزار تنقید نہ کرے۔ اس کانفرنس میں راقم الحروف بھی شریک تھا۔ ہر ایک نے اپنے دین کی خوبی بیان کرنے کے علاوہ دوسروں کے دین کی خوبی کو غور سے سنا اور سراہا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ ایک ایسی عالمگیر تحریک پیدا ہو گئی تھی جسے ان دونوں نے اپنے لیے مساوی طور پر خطرناک سمجھا۔ غالبؔ جیسے آزاد منش مفکر سے شیخ کو بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے اور برہمن کو بھی ایسا شخص کسی کے بھی عقائد سے مقلدانہ انداز میں متفق نہیں ہو سکتا۔ جب دونوں اسے اپنا مخالف پاتے ہیں تو ہنگامی طور پر ایک دوسرے سے کسی قدر متفق ہو جاتے ہیں۔ کسی ایک تحریک کے جائز یا ناجائز صحیح یا غلط اندیشے سے اگر پرانی دشمن ملتیں یک جا ہو جائیں تو یہ بھی نوع انسان کے لیے ایک بھلائی کی بات ہے

؎ فلک شرے برانگیزد کہ خیرما در آں باشد

صلح جو مفکر غالبؔ کی طرح اس اتفاقی اتحاد سے بھی خوش ہوتے ہیں۔ محض ظواہر اور شعائر کی تفریق سے گبرو مسلمان کے اختلاف پر اظہارِ تاسف غالبؔ کے ایک اور شعر میں بھی ملتا ہے۔ جس کا مضمون یہ ہے کہ یہ پیکارِ ملت کی آگ کو ہوا دینے والے حقیقت میں پندار اور خودی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ ادنیٰ خود غرضی اور تنگ نظری کے باعث ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتے ہیں۔ دراصل اخلاق اور روحانی زندگی کے متعلق یہ جھگڑا نہیں ہوتا محض ہٹ دھرمی ہوتی ہے۔ ایسے جھگڑوں میں اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ دونوں میں سے کوئی حق پر نہیں ہوتا۔ محض نفسی نزاع اور توہم کا چکر ہوتا ہے۔ غالبؔ کہتا ہے یہ ایک دوسرے سے الجھنا محض اس وجہ سے ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی خود غرضی کے محدود دائرے سے باہر نہیں نکل سکا۔

ملتوں میں باہمی رواداری کی تلقین غالب کا ایک پسندیدہ مضمون ہے جسے اس نے متعدد انداز میں دہرایا ہے۔

؎ از خود بروں نرفتہ و در ہم فتادہ تنگ
در راہِ حق بگیر و مسلماں خورم دریغ

غالب کا اُردو کا یہ شعر بھی اسی مضمون کا ہے

؎ ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

گردم ہلاکِ فرہ فرجام رہروے
کاندر تلاشِ منزلِ عنقا شود ہلاک

کہتا ہے کہ میں ایسے رہرو کی شاندار کامیابی پر جان دیتا ہوں جو منزلِ عنقا کی تلاش میں ہلاک ہو جائے اسلامی ادبیات کی مائتھولوجی میں عنقا کا ذکر اکثر آتا ہے عنقا یا سیمرغ کے متعلق یہ افسانہ ہے کہ وہ کوہ قاف میں کہیں رہتا ہے۔ انسانوں اور دیگر جانداروں اور پرندوں سے قدیم تر ہے۔ سارے عالم کی تاریخ سے واقف اور غیر معمولی حکمت کا مالک ہے۔ لیکن وہ مخلوقات سے ایسا روپوش ہے کہ اس تک کبھی کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ اسی لیے عنقا عسیر الحصول مدعا کے لیے مستعمل ہوتا ہے کہ اس کا وجود تو ہے اور مل جائے تو اس سے بڑا فیض حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا ملنا دشوار بلکہ محال ہے۔ انسان کا انتہائی مقصودِ حیات اسے خدا کہیں یا کسی اور تصور سے تعبیر کریں سہل الحصول نہیں۔ آسانی سے پورے ہونے والے مقاصد ادنیٰ مقاصد ہوتے ہیں۔ اولوالعزمی یہ ہے کہ ایسے مقاصد پیشِ نظر رکھ کر زندگی بسر کی جائے جو مفادِ قریب کے مقابلے میں

منازلِ بعید ہیں۔ انسان کے تمام انتہائی نصب العین اسی انداز کے ہیں۔ معرفتِ تامہ رحمتِ عامہ، عدلِ عالمگیر اور کامل انسان بننے کی کوشش جو خلاقِ فطرت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے ان تمام مقاصد کو غالب منزلِ عنقا کہتا ہے ذاتِ الٰہی کے طالب بھی منزلِ عنقا کی طرف سفر کرنے والے مسافر ہیں اس راستے میں فنا ہو کر بقا حاصل کرتے ہیں۔ رومی کے اس شعر کا بھی یہی مضمون ہے ؎

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما!
گفت آنکہ یافت مے نشود آنم آرزوست

عنقا کے متعلق غالب کے اردو شعر درج کیے جاتے ہیں

؎ تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم

سلطانیٔ قلمرو عنقا بہ من رسید
کو نقشِ ناپدید کہ بر خاتمِ انگنم!

اس قسم کے غم مقصود میں زندگی بسر کرنا ہر قدم پر قربانی کا طالب ہوتا ہے اگر اس غم میں نشاطِ پنہاں اور روح کے لیے باطنی تسکین نہ ہو تو کون ایسی جانکاہ زندگی قبول کرے ؎

غم لذتیست خاص کہ طالب بذوقِ آں
پنہاں نشاط و زر دو پیدا شود ہلاک

زندگی طرح طرح کی ظلمتوں سے لبریز ہے۔ علم و عمل کی دنیا میں جا بجا اندھیر

اور اندھیرا ہے۔ لیکن باطن میں اگر چراغ روشن ہو تو پھر یہ عالم تیرہ و تار وحشت انگیز نہ رہے گا۔ ؎

وحشتے نیست اگر خانہ چراغے دارد
با دل از تیرگیٔ زاویہ مغاک چہ باک

اگر بحرِ حیات کسی کی طلب میں موجزن ہے تو اس کا تموّج خس و خاشاک کی کیا پروا کرے گا۔ ہر قسم کے مادی اور جسمانی نقصانات ادنیٰ اور ناقابلِ اعتنا معلوم ہوں گے۔ خوف و حزن جاتا رہے گا۔ انسان لاخوفٌ علیہم ولا ہم یحزنون کے عالم میں زندگی بسر کرے گا۔

؎ بحر اگر موج زنست از خس و خاشاک چہ باک
با تو ز اندیشہ چہ اندیشہ و از باک چہ باک

بسکہ بہ پیچ بخویش جادہ زگمراہیم
رہ بدرازی دہد عشوۂ کوتاہیم

صراطِ مستقیم یا راہ راست اگر دراز بھی ہو تو بھی اسی کو اختیار کرنا سلامتی سے منزل رسی کے لیے قابلِ ترجیح ہوتا ہے۔

راہ راست برو گرچہ دور است

غالب کہتا ہے کہ گمراہی کا راستہ سیدھا راستہ نہیں اس میں بہت پیچ اور بہت موڑ ہیں۔ راہِ راست اگر دور تک چلی گئی ہے تو اس کی انتہا دکھائی نہیں دے سکتی لیکن پیچ و خم میں ہر موڑ سامنے نظر آتا ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ راستہ تھوڑا ہی باقی ہے ابھی ختم ہو جائے گا۔ اور منزل آ جائے گی۔ انسان کو جس راستے پر چلنا چاہیے وہ بہت دراز ہے۔ کیونکہ بقولِ عارفِ رومی "منزلِ ما کبریاست" لیکن گمراہ

انسان کے مقاصد بہت قریبی اور سہل الحصول ہوتے ہیں۔ ہر وقت یہی سمجھتا ہے کہ بس یہ چیز جو سامنے موڑ کی آڑ پر ہے اگر حاصل ہو گئی تو زندگی کامیاب ہو گئی۔ اس کیفیت کے بیان کے لیے غالب نے کیا اچھی تمثیل پیدا کی ہے۔ کہتا ہے کہ میری گمراہی کی وجہ سے میری زندگی کا راستہ پیچ در پیچ ہے جس کی وجہ سے راستہ دراز ہونے کے باوجود چھوٹا ہونے کا دھوکا پیدا کرتا ہے۔ ہوس پرست انسان مسلسل ایسے ہی دھوکوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر انسان کا قدم صراطِ مستقیم پر آ جائے تو اسے ہوسوں اور وسوسوں کے پیچوں سے نجات مل جائے۔ ہوس کا مقصود بہت نزدیک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایک ہوس کے موڑ پر پہنچ کر دوسری ہوس کا موڑ سامنے دکھائی دیتا ہے۔ پھر اسے سہل الحصول سمجھ کر انسان اس کی طرف گام زن ہوتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ یہ سب گمراہی کے پیچ و خم ہیں۔ جن سے راستے کے چھوٹا ہونے کا دھوکا پیدا ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ پیچ راستے کو اور دراز کر دیتے ہیں۔ صراطِ مستقیم پر چلنے والا راستے کے پیچوں میں چکر لگانے والے کے مقابلے میں منزلِ مقصود پر جلد پہنچے گا۔ عشوۂ کوتاہیٔ راہ پیچ و خم سے گمراہ ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ ہوس کے اشارے دھوکوں کے اشارے ہیں۔

تا حسن بہ بے پردگیٔ جلوہ صلا زد
دیدیم کہ تارے ز نقاب است نظر ہم

یہ مضمون بھی غالب کا خاص اور پسندیدہ مضمون ہے کہ حسنِ ازلی یا حقیقتِ سرمدی ظہور کے باوجود مستور ہے اور بے نقاب ہونے کے باوجود حجاب میں ہے۔ اردو اور فارسی کلام میں سو ڈھنگ سے یہ مضمون باندھا ہے۔ کہتا ہے حسنِ ازلی نے اعلانِ عام کر دیا کہ اب ہم بے پردہ ہو گئے ہیں جس کا جی چاہے

نظارہ کرے۔ لیکن جب ہم نے اس رُخِ زیبا پر نظر ڈالی تو خود تارِ نظر تارِ نقاب بن گیا۔ جس چیز کو تجلّیٔ ذات سمجھ رہا تھا وہ خود اپنی نظر کے نور کا تار و پود تھا۔ فلسفہ اور تصوّف دونوں میں یہ مضمون ملتا ہے کہ ہستیٔ مطلق ماورائے ادراک ہے۔ صفات و مظاہر میں اس کا زمانی و مکانی ظہور ہوتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت پوری طرح منکشف نہیں ہوتی۔ غرض رویتِ ذات کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ جس کیفیت کو دیکھنے والا ذاتِ سرمدی کا ظہورِ منزّہ سمجھتا ہے۔ اس میں خود اس کی اپنی نظر کی آمیزش ہوتی ہے۔ نظر خود نقاب بن جاتی ہے، علم خود حجابِ اکبر ہو جاتا ہے غالبؔ کو حقیقتِ ہستی کے پُراسرار اور ناقابلِ فہم ہونے کا شدید احساس ہے۔ وہ نواہائے راز سُنتا ہے ہستی کا ساز بھی نظر آتا ہے لیکن سازندہ کا ہاتھ اور مضراب نظر سے اوجھل ہیں۔ ؎ پیدا نہ اسے جنبشِ مضراب کجائی

خدا تو پردے میں مستور رہنا نہیں چاہتا۔ لیکن حُسنِ ازلی نظارہ سوز ہے اس لیے بے حجاب ہونے پر بھی زیرِ نقاب ہی رہتا ہے۔

؎ جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز!
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

چون است کہ در عرصۂ دہر اہلِ دلے نیست
در بحر کف و موج و حباب است و گہر ہم

جسمانی لحاظ سے دُنیا انسانوں کا ہجوم ہے۔ لیکن دیوجانس کلبی دن کی روشنی میں بازار کی بھیڑ میں انسان کو تلاش کر رہا تھا۔ اس پر عارفِ رومی نے بھی لطیف اور بلیغ اشعار کہے ہیں۔

؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
ازہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ یزدانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

حیوان نما انسان کثرت سے ملتے ہیں۔ لیکن انسانیت کا امتیازی جوہر رکھنے والے دکھائی نہیں دیتے۔ وہ جوہر جس نے آدمؑ کو مسجودِ ملائک بنایا۔ دنیا اہلِ دل سے کبھی خالی نہیں رہی۔ اگر اہلِ دل معدوم ہو جائیں تو نوعِ انسانی کی بقا کا بھی کوئی موجب باقی نہ رہے۔ اہلِ دل کمیاب ضرور ہیں لیکن عالمِ انسانی اُن سے خالی نہیں رہ سکتا۔ کم یاب اس قدر ہیں کہ انھیں ڈھونڈنے اور پانے کے لیے شدید طلب اور تلاش کی ضرورت ہے۔ بقول اقبال

خُدا ہم در تلاشِ آدمی ہست

غالبؔ کہتا ہے کہ قلزمِ حیات میں لہریں بھی ہوتی ہیں جھاگ بھی اُٹھتے ہیں۔ بُلبلے بھی اُبھرتے اور تیرتے ہیں۔ لیکن اس کی تہ میں موتی بھی ہوتے ہیں۔ دریا سے انسانیت کی کیفیت بھی یہی ہونی چاہیے۔ عام انسان تو کف و موج و حباب ہی ہیں یا لہروں میں تھپیڑے کھانے والے خس و خاشاک ہیں۔ لیکن اس دریا میں پاکیزہ گہر انسان نہیں ملتے۔ قلزمِ انسانیت میں بھی تو کہیں موتی نظر آنے چاہئیں

انسانوں کے اکثر افکار اور عقائد دراصل توہمات اور بے اصل تصورات ہیں صورت پرستی میں ذوقِ معنی موجود نہیں۔ غالبؔ کہتا ہے کہ انسانیت کا قافلہ

یوسفِ معنی کو ہمراہ اور اس کی حفاظت کا ذمہ لے کر نکلا۔ لیکن اسے توہمات کے کنوئیں میں دھکیل کر آگے چل دیا۔ اب اس چار سوئے دہر میں اوہام کا کاروبار ہے۔ جلوۂ معنی کہیں نظر نہیں آتا۔

؎ جلوۂ معنی بجیبِ وہم پنہاں کردہ ایم
یوسفے در چار سوئے دہر نقصاں کردہ ایم

ذوقِ معنی کے متعلق غالب کا ایک اور شعر پہلے درج ہو چکا ہے۔ لیکن اس شعر کے ساتھ دہرانے کے قابل ہے ؎

فضا از ذوقِ معنی شیرۂ می ریخت در جانہا
نمے از لالۂ پالایش چکید و آبِ حیواں شد

جسے آبِ حیات کہتے ہیں معنی کی شیرینی کے مقابلے میں وہ بھی بے حقیقت ہے۔ محض جسمانی زندگی کو دراز کرنے والا آبِ حیات پیمانۂ معنی کی تلچھٹ ہے۔

ز من خدر نہ کمنی گر لباسِ دیں دارم
نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

غالب نے تو کبھی لباسِ دین اختیار نہیں کیا۔ نہ جبہ، نہ عمامہ، نہ ہاتھ میں تسبیح نہ ریش دراز نہ ظاہر میں زہد و تقویٰ کی کوئی علامت، لہٰذا یہ شعر اس کی اپنی ذات کے متعلق تو نہیں ہو سکتا۔ اس میں وہ مومن نما کافروں کی ایک قسم کا ذکر کر رہا ہے۔ بعض لوگوں نے مذہبی زندگی کی نمائش کے لیے ایک خاص قسم کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ لوگ انھیں دیکھ کر زندہ دلی یا رنگینی یا آزاد خیالی کی کوئی بات نہیں کرتے لیکن جب ان زہاد سے کوئی معاملہ پیش آ جائے تو منکشف ہوتا ہے کہ یہ لوگ قول کے مومن وضع ظاہری کے مسلمان۔ لیکن عمل کے کافر ہیں۔ انھوں نے دنیا

خواہشوں کو معبود بنا رکھا ہے۔ وہ حقیقت میں انھیں معبودوں کی پوجا کرتے ہیں ایک شخص رشوت دینا یا لینا چاہتا ہے۔ وہ متقیانہ لباس والے شیخ کو دیکھ کر ہچکچائے گا۔ کہ اس سے ایسی جرأت کیونکر کروں۔ لیکن اگر شیخ صاحب کو رقم ملتی نظر آئے تو وہ فرمائیں گے کہ بھائی ہمارے ظاہری لباس پر نہ جاؤ۔ ہم بھی اصل میں دنیا دار ہیں اور اپنی حاجتیں رکھتے ہیں۔ ضرورت انسان سے سب کچھ کرا دیتی ہے۔ خدا معاف کرنے والا ہے۔ ہمارے تقوے سے مت گھبراؤ۔ آؤ ہمیں بھی اس میں شریک کر لو۔ یا اس قسم کا بودا مومن کسی حسن فروش سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ اسے مولوی صاحب سمجھ کر گھبراتی ہے تو غالب کا یہ شعر ان کے کام آ جائے گا کہ ہمارے لباس سے دھوکا کھا کر ہمیں متقی نہ سمجھ لو۔ ایسے نمائشی دیندار ہماری ملت میں کثرت سے نظر آتے ہیں جو لباسِ دین کے اندر نہفتہ کافر ہیں انھیں حضرت مسیحؑ نے بھیڑوں کی کھال پہنے ہوئے بھیڑیے کہا ہے۔ اس قسم کے لوگ کہیں فتنہ انگیز سیاست میں نظر آتے ہیں۔ کہیں اُمراء اور وزراء کے دروازوں پر گداگری کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ کہیں اطمینان سے چور بازاری میں دولت اندوزی کر رہے ہیں۔ عرفی بھی کہتا ہے شیخ و برہمن میں اتنا ہی فرق ہے کہ ایک کے سر میں تو ہمات اور ہوا و ہوس کے اصنام ہیں جن کی وہ پوجا کرتا ہے اور دوسرے کی آستین میں پنہاں ہیں۔ کفارِ عرب چھوٹے چھوٹے بت اپنی دراز آستینوں کے اندر رکھتے تھے

اور ابت است و در سرور آستیں ندارد

ایسے شیوخ کے متعلق عرفی کا صحیح فتویٰ ہے۔ اقبال بھی کہتا ہے

؎ اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

دولت بغلط نہ بود از سعی پشیماں مشو
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

اس سے پہلے بعض اشعار کی شرح میں بیان ہو چکا ہے کہ بعض فارسی شعرا نے کفر کی اصطلاح کن معنی میں استعمال کی ہے۔ ہر دین میں کچھ عقائد ہوتے ہیں۔ کچھ عبادات و شعائر کچھ رسوم و ظواہر، یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ خاص قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ شرائع اور آئین کے بغیر زندگی میں ضبط و نظم قائم نہیں ہو سکتا۔ عبادت کے کچھ طریقے مقرر نہ ہوں تو عبادت بالجماعت نہیں ہو سکتی۔ اگر عقائد کو معینہ الفاظ میں بیان نہ کیا جائے تو ان میں ابہام پیدا ہو جائے گا۔ اور دین میں تشتت و انتشار دخل پائے گا۔ لیکن عقائد اور عبادات کا مقصود تزکیۂ باطن قرب الٰہی اور خدمت خلق ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اقرار باللّسان اور ظواہر کی پابندی کے باوجود باطن میں خشوع و خضوع نہیں ہوتا۔ دیدۂ بصیرت روشن نہیں ہوتا۔ صورت پرستی میں ذوقِ معنی گم ہو جاتا ہے۔ عقائد میں استدلالی بحثیں دین کی لذت سے معرّا ہوتی ہیں۔ مذہب کے شعائر کی شدید پابندی میں مذہب کی حقیقت فراموش ہو جاتی ہے۔ کورانہ تقلید سے طبیعتوں میں جمود آ جاتا ہے۔ جس شخص میں حقیقی روحانیت ہوتی ہے۔ اس کی نظر ظاہر کے بجائے باطن پر رہتی ہے۔ اس پر محبت کا غلبہ ہوتا ہے وہ حکمت کا طالب ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اقوال، احوال اور افعال مقرر سانچوں میں نہیں ڈھلتے۔ وہ کسی مذہبی فرقے کا پیرو نہیں ہوتا۔ فکر و ذکر میں اس کے اندر کچھ انفرادی رنگ ہوتا ہے۔ اس کی باتیں فقیہوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ "استفت قلبک" کے ماتحت اس کے فتوے پیشہ ور مفتیانِ دین سے الگ قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افعال عشقِ الٰہی کے مطابق ڈھالتا ہے یا وہ خود بخود اس کے مطابق ڈھلتے ہیں۔ آخر مروجہ دین کے پیرو ان کے

پیشہ ور رہبر ایسے لوگوں کو جادۂ شریعت سے ہٹا ہوا سمجھ کر کافر کہنے لگتے ہیں۔ مسلمانوں میں تکفیر کی داستان بڑی طویل ہے۔ بڑے بڑے اولیاء کرام اور بڑے بڑے ائمہ عصر پر تنگ نظر اور ظاہر پرست لوگوں نے کفر کے فتوے لگائے۔ سب سے پہلے یہ کہ ہر نبی کو اس کی اپنی قوم کافر سمجھتی ہے۔ اس لیے کہ وہ محقق ہوتا ہے۔ مقلد نہیں ہوتا۔ اور خدا کی طرف سے اسے وہ ہدایت ملتی ہے جس سے دوسرے محروم ہوتے ہیں وہ کور و کر و گنگ ملت میں چشم بینا اور گوش حقیقت نیوش رکھتا ہے۔ مقررہ راہوں سے ہٹ کر آزادی سے سوچنا اور عمل کو ضمیر کے مطابق اور خدا کی ہدایت کے موافق ڈھالنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ یہ خاص فیضانِ الٰہی ہے جو خاص بندوں پر ہوتا ہے۔ اگر مبداء فیاض سے خاص ملکات و دیعت نہ ہوں تو کوئی شخص محض کوشش اور جدوجہد سے نبی یا مصلح اعظم نہیں بن سکتا۔ عوام آبا و اجداد کی ڈگر پر چلتے ہیں۔ خواہ وہ راستہ گمراہی کا راستہ ہو۔ عام انسان تحقیق کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے وہ مقلد ہی رہتے ہیں۔ غالب کہتا ہے کہ انھیں مقلد ہی رہنا چاہیے۔ کیونکہ غیر معمولی صلاحیتیں ان میں نہیں۔ عرفی بھی ایک شعر میں کچھ اسی قسم کی نصیحت کرتا ہے۔ اگر تو افلاطون بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو مقلد اور جاہل رہنا ہی بہتر ہے۔ ادنیٰ درجے کے آدمی کے لیے اس میں سلامتی اور آسائش ہے۔ بین بین راستہ جس میں نہ پوری تحقیق ہو، نہ کامل تقلید کوئی طمانیت پیدا نہیں کر سکتا۔

ے قدم بروں منہ از جہل یا فلاطوں شو
اگر میانہ گزینی سراب و تشنہ لبیست

عارف رومی سے اس زمانے کے ایک بڑے شیخ کے فرستادہ مناظر نے دریافت کیا کہ آپ مذہبی فرقوں میں سے کس میں داخل ہیں۔ انھوں نے جواب

دیا کہ میں تو سب سے متفق ہوں۔ اُس نے بھنّا کر کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ملحد اور کافر ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ میں اس سے بھی متفق ہوں۔ لوگوں نے جس چیز کو دین سمجھ رکھا تھا۔ رُومی جیسا صاحبِ بصیرت اس سے الگ تھا۔ لیکن ہر ایک کی خوبی پر نظر رکھتا تھا۔ بقولِ میر دردؔ

آتے ہیں مری نظر میں سب خوب
جو عیب ہے پردۂ ہنر ہے

اور ان کا اپنا مسلک یہ تھا کہ 'مذہبِ عشق از ہمہ دیں جداست'۔ میر تقی بھی فرماتے ہیں سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ۔ مذہبِ عشق اختیار کیا۔ غالبؔ بھی یہاں کافر کی اصطلاح انہیں معنی میں استعمال کر رہا ہے اور اس قسم کی بصیرت کو فیضانِ الٰہی سمجھتا ہے جو محض کوششوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس غزل کے تمام اشعار نہایت پرمعنی اور حکیمانہ ہیں۔ دوسرا شعر ہے

ے از ہرزہ رواں گشتن قلزم نتواں گشتن
جوئی بخیاباں رو سیلی بہ بیاباں شو

انسان کو اپنی صلاحیت کا اندازہ کر کے اپنی قوتیں خاص مقاصد میں مرتکز کرنی چاہئیں۔ آوارہ خیالی اور پریشان عمل سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اگر پانی کی موجیں ہر سمت میں منتشر ہوتی جائیں تو نہ اس سے کوئی ندی نالہ بن سکتا ہے اور نہ کوئی قلزم۔ بعض لوگوں میں غیر معمولی قوتِ عمل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ سیلِ کہسار کی طرح ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو میدانوں میں دریا بن کر کناروں کے اندر بہنا چاہیے تاکہ ان سے بے آب خطے سیراب ہو سکیں۔ اگر قوتِ عمل میں یہ زور شور یہ پہنائی اور یہ سیلان نہیں تو جوئے کم آب و سہل رَو کی طرح کسی خیاباں میں بہ کر اسے سیراب کرنا چاہیے۔ بہرحال فطرت کی طرف سے جو کچھ

ودیعت ہُوا ہے اسے ہرزہ روی میں فنا کرنا چاہیے۔ بڑے اولوالعزم مصلحین اور فاتحین کو سیلِ بیاباں اور شاعروں کو جوئے خیاباں سمجھ لیجیے۔ لیکن دونوں کی زندگیاں اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں جب فطری قوتیں انتشار سے بچائی جائیں۔

ے ہم خانہ بسامان بہ ۔ ہم جلوہ فراواں بہ　　در کعبہ اقامت کن ۔ در بت کدہ مہماں شو

پہلے ایک شعر میں کہہ چکا ہے

دلم در کعبہ از تنگی گرفت، آوارہ خواہم !
کہ با من وسعتِ بت خانہائے ہند و چیں گوید

میں کعبے میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوں اور اب کچھ ہند و چین کے بت خانوں کی بھی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ اب اس شعر میں کہہ رہا ہے کہ بت کدوں کی سیر کا شوق تو بجا ہے کیونکہ ان میں گوناگوں جلوے ہوں گے اور ملتوں کے شعائر کا تماشا دیکھوں گا۔ لیکن اس سیر اور شوقِ جلوہ کے ساتھ ساتھ اپنا ایک مستقل ٹھکانا بھی ہونا چاہیے۔ آدمی کی اساس اپنی ملت ہی کی زندگی ہوتی ہے۔ اسلام ہمارا گھر ہے اور ہمارا اخلاقی و روحانی سرمایہ اسی کے اندر ہے۔ شوقِ جلوہ میں تھوڑے عرصے کے لیے بُت کدے میں مہمان رہنا چاہیے۔ لیکن اقامت کعبے ہی میں ہونی چاہیے۔ ے

آوازۂ معنی را بر سازِ دبستاں زن
ہنگامۂ صورت را بازیچۂ طفلاں شو

مدرسوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ رسمی قسم کی ہوتی ہے۔ عام معلّم وسط درجے کی استعداد بلکہ بسا اوقات اس سے بھی کم صلاحیت رکھتے ہیں۔ درسی کتابوں کو زبان اور صرف و نحو کے نقطۂ نظر سے پڑھاتے ہیں۔ شاعروں کا کلام

پڑھانے والوں میں ذوقِ شعریت کی کمی ہوتی ہے۔ بہت سے طلبہ محض سند حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ دینی تعلیم بھی اس انداز کی نہیں ہوتی کہ پڑھنے والوں میں کچھ روحانیت پیدا ہو۔ معلّم میں خود ذوقِ تحقیق نہیں ہوتا۔ وہ مقلّدوں کا مقلّد ہوتا ہے۔ بعض کتابوں کی شرح ہی نہیں، بلکہ شرح کی شرح پڑھائی جاتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ مدرسوں میں علم و فن کا صحیح ذوق پیدا ہو۔ اس قسم کا عام تعلیم یافتہ ایک نیم خواندہ سا انسان ہوتا ہے اور تھوڑا علم جہالت سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ غالبؔ کی قسم کے بالغ نظر مدرسوں کی پیداوار نہیں ہوتے انوریؔ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے اشعار کوئی طالب علم کسی مدرّس کے پاس لے گیا جس کی طبیعت شعر کی لطافت اور نزاکت سے محروم تھی۔ مدرّس نے انھیں عروض اور صرف و نحو کی کسوٹی پر پرکھ کر کچھ معاندانہ تنقید کی۔ انوریؔ تک یہ بات پہنچی تو اس نے کہا کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" طالب علم میں ذوقِ معنی وہی معلّم پیدا کر سکتا ہے جس کی طبیعت میں فطرت نے یہ ملکہ ودیعت کیا ہو۔ آج تک مہذب ممالک اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اندازِ تعلیم کچھ اس قسم کا ہو جس سے پڑھنے والے کے دل و دماغ دونوں کی تربیت ہو۔ مروّجہ تعلیم سے عوام کو کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن اعلیٰ طبیعتیں مدرسوں کے نظام کو ایک بوجھ ہی محسوس کرتی ہیں۔ غالبؔ کہتا ہے۔ کچھ ایسی کوشش کرو کہ سازِ دبستاں پر کچھ آوازۂ معنی بھی سنائی دے۔ الفاظ اور بیان کی محض ظاہری صورت محض بازیچۂ اطفال رہ جاتی ہے۔ خود معلّم کا یہ حال ہوتا ہے کہ

مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت

نوجوانوں میں زندگی کی اُمنگیں افسردہ و پژمردہ کر دی جاتی ہیں۔ علّامہ اقبالؔ ایسے معلّم اور متعلّم کے متعلق فرماتے ہیں ؎

این بہ پیری کودک و آں پیر در عہدِ شباب

اور طریقِ تعلیم میں انقلاب کی آرزو کرتے ہیں۔ غالبؔ کہتا ہے کہ اصل تعلیم وہ ہے جو انسان کو صورت سے معنی کی طرف لے آئے۔

گر چرخ فلک گردی سر بر خطِ فرماں نہ
ور گوئے زمیں باشی و تفِ خمِ چوگاں شو

غالبؔ کہتا ہے کہ زمین ہو یا اجرامِ فلکیہ، دنیا و مافیہا میں کوئی چیز نہیں جو آئینِ الٰہی کی پابند نہ ہو۔ انسان آسمان کی طرح بلند ہو جائے تو بھی وہ فرمانِ الٰہی کی اطاعت سے گریز نہیں کر سکتا اور اگر زمین پر رہنے والا خاکسار ہو تو بھی اس کی حرکات چوگانِ قضا و قدر کے ماتحت ہیں۔ غالبؔ کے زمانے میں علماءِ ہند ابھی تک زمین کے ایک کُرۂ مدوّر ہونے کے قائل نہ تھے۔ لیکن غالبؔ زمین کو ایک گیند سے تشبیہ دیتا ہے جو خدا کے مقرر کردہ قانونِ تجاذب سے لڑھک رہی ہے۔ قانونِ تجاذب طبیعی بھی ہے اور نفسی و روحانی بھی۔ انفس و آفاق میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے لیے آئین کی پابندی لازم ہے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ اس قانون کی معرفت حاصل کر کے اس کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ قانون سے بغاوت فطرت کے خلاف بغاوت ہے۔ جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

آوردہ غمِ عشقم در بندگی ایزد ! ؎
اے داغ بدل در رو و از جبہ نمایاں شو

بندگیٔ ایزد انسان کا وظیفۂ حیات ہے۔ لیکن مختلف طبیعتیں مختلف رستوں سے اس کی طرف آتی ہیں۔ ایک علم و حکمت کا راستہ ہے۔ انسان حیات و

SALEEM LIBRARY
1/8 Sheranwala Gate,
Line Subhan Khan Lahore

کائنات پر غور کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات کی خلّاق ہستی حکیم و علیم و رحیم ہے اور عقل کا یہی تقاضا ہے کہ انسان اس کی معرفت حاصل کر کے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور اپنی خواہشوں کو اس کے ارادے کے مطابق بنائے بعض لوگ بندگی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ حاکمِ کائنات کا حکم ہے جس کا بجا لانا لازم ہے وہ اس حکم کی حکمت کو نہیں ٹٹولتے۔ بعض اور طبیعتیں ہیں جن کے لیے بندگی ایک قسم کی تجارت ہے اور اس بندگی سے انھیں دُنیا و آخرت میں اجر و ثواب کی توقّع ہوتی ہے۔ ایسے عابدوں کی نسبت ذوقؔ کہتا ہے کہ

؎ کب حق پرست زاہدِ جنّت پرست ہے!
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

وہ اس دنیا میں شہوات کے معاملے میں اس لیے کچھ ضبط برتتا ہے کہ یہی شہوات آخرت میں وسیع پیمانے پر پوری ہوں۔ غالبؔ کا اردو میں یہ شعر ہے

؎ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ممکن ہے غالبؔ کو یہ مضمون ولیہ رابعہ کے اس قصّے سے سوجھا ہو۔ کہ ایک روز دیکھا گیا۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی کا کٹورا اور دوسرے ہاتھ میں کسی ظرف میں دہکتے ہوئے کوئلے لے جا رہی ہیں لوگوں نے پوچھا کدھر کا ارادہ ہے فرمایا اس پانی سے دوزخ کی آگ بجھانے اور اس آگ سے جنّت کو سوخت کرنے جا رہی ہوں تاکہ لوگ عبادت خالصةً للّٰہ کریں اور ثواب و عذاب کے محرکات سے اسے خراب نہ کریں۔

اقبالؔ کی ابتدائی نظموں میں بھی اس مضمون کا ایک شعر ملتا ہے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے اے بے خبر جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے

غالبؔ کہتا ہے کہ میں جو بندگیٔ ایزدی کی طرف مائل ہوتا ہوں تو نہ از راہِ حکمت اس کی طرف آیا ہوں اور نہ بغرضِ تجارت بلکہ غمِ عشق مجھے ادھر لایا ہے اخلاق اور طاعت میں عشق ہی سب سے زیادہ مؤثّر محرک ہے۔ عاشق کوئی مزدور نہیں ہوتا جو اُجرت کا طالب ہو وہ معشوق کی طرف ایک جذبے سے کھچا جاتا ہے۔ اور چونکہ محبوب کمالات کا جامع ہے خود جمیل اور جمال آفرین ہے اس لیے جو شخص عشق کے راستے سے طاعت کی طرف آتا ہے اس میں خود بخود صفاتِ حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے کمال کا اجر خود ان اعمال سے خارج نہیں ہوتا۔ عشق وسیلہ بھی ہے اور مقصود بھی۔ عاشق سے پوچھا جائے کہ تم کیوں عشق ورزی کرتے ہو تو وہ کسی خارجی محرک کا ذکر نہ کرے گا۔ غالبؔ کہتا ہے کہ زاہد اجر کوش کا سجدہ بھی اس کی پیشانی پر اثرِ سجود پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کا سجدہ اصل سجدہ نہیں اور اس کا نشان بھی محض اس کی جلد پر ایک داغ ہے۔ عشق سے طاعت کی طرف آنے والے کا یہ حال ہوگا کہ پہلے اس کے قلب پر داغِ غمِ عشق کی مہر لگے گی۔ پھر یہ داغ اس کی پیشانی پر بھی ابھر آئے گا۔ باطن کا اثر ظاہر پر نمایاں ہونا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ظاہری سجدے کی علامت باطن میں بھی داغِ عشق پیدا کر سکے۔ اگر بندگی اپنی گہرائی میں عشق کے درجے تک نہیں پہنچی یا خود عشق سے سرزد نہیں ہوئی تو وہ حقیقی تزکیۂ نفس اور ترقیٔ باطن کا موجب نہیں بن سکتی۔

در بندِ شکیبائی مردم ز جگر خائی!
اے حوصلہ تنگی کن اے غصّہ فراواں شو

جدید نفسیات اس پر متفق ہیں کہ فطرت نے انسان کے اندر جو جذبات پیدا کیے ہیں انھیں بہت زیادہ دبائے رکھنے سے نفسی اور اخلاقی بیماریاں پیدا ہوتی

ہیں۔ زندگی کا سارا کاروبار جذبات ہی سے چلتا ہے۔ اس کی تنظیم ہونی چاہیے اور کسی جذبے کو بے عنان نہ ہونا چاہیے۔ ہر جذبے کو کسی اعلیٰ مقصد میں صرف کرنا لازمی ہے۔ رہبانیت اور زہدِ خشک میں یہی نفسیاتی غلطی ہے کہ بندِ شکیبائی میں خواہ مخواہ جگر خائی پیدا ہوتی ہے۔ جسمانی اور نفسی کیفیات میں فتور آتا ہے۔ نفس کشی کے صحیح معنی جذبات کشی نہیں بلکہ جذبات کا بلند مقاصد کی طرف رُخ پھیرنا ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ غمِ عشق کے متعلّق ایسی حوصلہ مندی برتنا درست نہیں کہ جذبہ جو زندگی کا محرّک ہے وہی فنا ہو جائے۔ اسی لیے یہ خواہش کرتا ہے کہ

اے حوصلہ تنگی کن لے غصّہ فراواں شو

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغارت بر

بر خرمنِ ما برقے بر مزرعہ باراں شو

قرآن کریم میں مومنین کی صفات میں اس صفتِ حسنہ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ "مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ"، کہ خدا جو کچھ انھیں عطا کرتا ہے۔ وہ اس میں سے بطیبِ خاطر نیکی کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس ظاہری یا باطنی سرمایہ نہ ہو تو اسے انفاق کی توفیق کہاں سے ہو گی؟ اچھے انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ جِد و جہد اور جائز کوششوں سے بہت کچھ حاصل کرتا رہتا ہے لیکن جو کچھ حاصل کرتا ہے اسے اپنے پاس صندوقِ امساک میں جمع نہیں رکھتا۔ اگر اس کے پاس علم کا سرمایہ ہے تو وہ اسے دن رات دوسروں پر نچھاور کرتا ہے۔ اس ایثار سے خود علم میں ترقی ہوتی ہے۔ اگر اس کے پاس محبّت کا سرمایہ ہے تو وہ اسے خلقِ خدا پر پھیلاتا رہتا ہے۔ محبّت کا حال بھی علم ہی جیسا ہے کہ صرف کرنے سے اس میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے۔ غالبؔ خدا سے دعا کرتا

ہے کہ پہلے بارانِ رحمت سے تو میری کشتِ حیات سرسبز کر۔ میرا نخلِ مراد بارآور کر پھر مجھے توفیق دے کہ اس حاصل کو اندوختن کے بجائے انفاق فی سبیل اللّٰہ میں لٹاتا جاؤں۔ یہاں تک کہ وہ حاصل اس طرح ختم ہو جائے جس طرح برق سے خرمن سوخت ہو جاتا ہے۔ فنا اور بقا نبضِ حیات کے زیر و بم ہیں۔ جب تک ہر بقا کو مسلسل فنا آمادہ نہ رکھیں مزید ارتقا اور اعلیٰ تر بقا ممکن نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے وحی کے متعلق بھی اسی تمثیل سے کام لیا ہے کہ اس میں بارش بھی ہوتی ہے۔ اور رعد و برق بھی۔

اقبالؔ کا یہ شعر بھی اس کی شرح میں پیش کیا جاتا ہے۔

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب

جل گئی مزرعِ ہستی تو اُگا دانۂ دل

چوں زبانہا لال و جانہا پر ز غوغا کردۂ

بایدت از خویش پرسید آنچہ با ما کردۂ

گر نہ مشتاقِ عرضِ دستگاہِ حسنِ خویش

جاں فدا بینت دیدہ را بہر چہ بینا کردۂ

ہفت دوزخ در نہاد شرمساری مضمر است

انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردۂ

اس ساری غزل میں غالبؔ نے خدا کو مخاطب کر کے کہیں شکر ادا کیا ہے اور کہیں مؤدبانہ شکایت کی ہے۔ مطلع میں ایک لطیف انداز کی شکایت ہے۔ کہ انسانوں کی جانوں میں تو تُو نے محشر برپا کر رکھا ہے اور دوسری طرف یہ ہے کہ یارائے اظہار نہیں یہ قیامت انگیزی سمجھ میں نہیں آتی۔ اب تو اپنے آپ ہی سے

...LIM LIBRARY
1/8 Sher ...wala Gate,
Line Subhan Khan Lahore.

پوچھو کہ ہم سے یہ کیا معاملہ کیا ہے۔ غالب کے کلیاتِ اُردو میں بھی پہلا شعر اسی قسم کی شکایت کا ہے کہ نقشِ انسان مصوّرِ ازلی کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے۔ مثنوی مولانا روم میں بھی پہلا بلیغ شعر شکایت ہی کا اظہار ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت مے کند
وز جدائیہا شکایت مے کند
از نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

غزل کے دوسرے شعر میں کہتا ہے کہ چشمِ انسان کو بینا کرنے سے صاف طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تو خود اپنے جمال کو نظارے کا معروض بنانا چاہتا ہے ابن عربی نے فصوص الحکم میں فصِ آدم میں لکھا ہے کہ خدا اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہی اشتیاقِ عرضِ حُسن آفرینشِ آدمؑ کا باعث ہُوا۔ شیخ اکبر نے اس میں یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ انسان کے معنی آنکھ کی پُتلی ہیں۔ فارسی میں بھی آنکھ کی پُتلی کو مردمکِ چشم کہتے ہیں۔ انسان خُدا ہی کی آنکھ ہے جو اس نے اپنے جمال کے مشاہدے کے لیے بنائی۔

تیسرے شعر میں جزا و سزا کے متعلق ایک لطیف مضمون ہے۔ خدا بخشنے والا ہے۔ مجھ ایسے مجرم سے بھی کہے گا کہ تمھاری گنہگاری تو مسلّم ہے لیکن جاؤ تمھیں معاف کیا۔ کہتا ہے کہ حسّاس طبیعت کے لیے تو اس شرمساری ہی میں سات دوزخوں کا عذاب ہے۔ یہ بخشش اور یہ مدارا بھی انتقام سے کم نہیں۔

اس غزل میں ایک اور شعر اسی ابن عربی کے مضمون کا ہے جو ایک لحاظ سے وحدتِ وجود کا نظریہ ہے۔ کہ جلوہ اور نظارہ نور اور نظر ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ناظر و منظور، شاہد و مشہود ایک ہی ہیں۔ پردۂ خلق میں خدا خود اپنا تماشائی رہے

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردہ ام

اسی غزل میں وہ حکیمانہ مضمون بھی ہے۔ جسے ہم پہلے ایک شرح میں درج کر چکے ہیں۔ یعنی خدا کے حکیم و رحیم ہونے کا یہ ایک قطعی ثبوت ہے کہ اس نے ہر قسم کے علاج کا سامان رنج و مرض سے پہلے پیدا کیا۔ آئینِ حیات کے مطابق رنج و مرض کا ظہور لازم تھا۔ اگر فطرت پیش بندی کر کے اس کا مداوا پہلے سے مہیا نہ کرتی تو البتہ اسے بے نیاز یا ظالم کہ سکتے تھے۔ لیکن کوئی مرض ایسا نہیں جس کا علاج فطرت کے آئین کے اندر ہی موجود نہ ہو اور جس کے اسباب مہیا نہ ہوں۔ دوائیں زیادہ تر جمادات و نباتات سے بنتی ہیں اور بیماریاں جانداروں میں ہوتی ہیں۔ ارتقا کی زمانی ترتیب میں سنگ و گیاہ یعنی جمادات و نباتات کی آفرینش حیوانات اور انسان سے پیشتر ہوئی۔ جدید سائنس بھی اس مسئلے میں غالب کی مؤید ہے

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازاں کایں در رسد آنرا مہیا ساختی

ایک اور غزل میں مطلع سے مقطع تک خطاب بہ خدا ہی ہے جس میں شکر و شکایت کی عجیب آمیزش ہے۔

بر دست و پائے بند گرانے نہادہ ام
نازم بہ بندگی کہ نشانے نہادہ ام

ہاتھ پاؤں تو عطا ہوئے ہیں لیکن قضا و قدر نے ان کی حرکت پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اب اسے مجبوری کہ لو یا بندگی۔ بہر حال دستِ بستہ ہونا بندگی کا ایک نشان تو ہے۔

؎ گوہر ز بحر خیزد و معنی ز فکر ژرف
برما خراجِ طبعِ روانے نہادۂ

سمندر کو روانی بخشی ہے اور ساتھ ہی اسے گہر خیز کر دیا ہے۔ اسی طرح مجھے گہرا فکر عطا کیا ہے۔ جس کی گہرائیوں میں سے گہر ہائے معانی نکلتے ہیں۔ گویا ہماری طبع رواں کو مملکتِ معانی کا خراج ادا کرنے کا حکم ہے۔ پھر کہتا ہے کہ انسانی زندگی کو بغور دیکھو تو وہ حسرتوں اور ناکامیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ لیکن اُمیدِ راحت کا ایک دھوکا پیدا اور زندگی میں لُطف کی نشان دہی کر کے انسانوں کے لیے اسے قابلِ برداشت بنا دیا ہے۔ ایک انداز سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ کرم بھی ستم ہی ہے۔ لیکن انسان بعض اوقات مصائب میں مبتلا ہو کر خستہ و ناچار ہو جاتا ہے۔ اور یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

کوئی امید بر نہیں آتی ۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی

یہ بھی تیرا کرم ہے کہ تو نے موت کے اندر امن و امان کا احتمال پیدا کر دیا ہے۔ زندگی کیسی ہی دشوار اور ناقابلِ برداشت ہو۔ بہر حال موت تمام مصیبتوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ یہاں احتمال کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کہ مر کر بھی امان ملنا کوئی یقینی بات نہیں۔ لیکن انسان یوں سمجھ کر ایک راہِ گریز پانے کی توقع رکھتا ہے۔ یہاں ذوق کا وہ شعر درج کرنے کے قابل ہے جو غالب کو بہت پسند تھا۔

؎ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

غالب کی اس فارسی غزل کا شعر یہ ہے

؎ تا خستۂ بلا نبود بے گریزگاہ
در مرگ احتمالِ امانے نہادۂ
رازاست گر دلے بجفائے شکستۂ
وادا ست گر سرے بسنانے نہادۂ

یہاں اچھے اچھے دل توڑے جاتے ہیں اور حسینؓ جیسے شہدا کے سر نیزوں پر نظر آتے ہیں۔ خلاقِ فطرت ظالم تو نہیں ہو سکتا لہٰذا بہر حال اس شکستگی اور جان سپاری میں کچھ راز ہو گا۔ جسے ہم جفا سمجھتے ہیں۔ شاید امتحانِ وفا ہو اور جسے ہم بیداد سمجھتے ہیں وہ بھی پنہاں عدل ہی ہو۔ بقول اقبال شاید دل کا آئینہ شکستہ نگاہِ آئینہ ساز میں عزیز تر ہو۔

طلبِ نشاط اور ذوقِ مسرّت۔ بے حقیقت چیزیں ہیں۔ لیکن فطرت نے ہر دل پر یہ افسوں پھونکا ہے اور ہر تن کو عطائے جان کی وجہ سے سپاس گزار بنا دیا ہے۔ یہ سپاس زبانِ حال ہی کا سپاس ہے۔ کیونکہ کوئی زندہ جسم زندگی کو برا سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہونا نہیں چاہتا

؎ بر ہر دلے فسونِ نشاطے دمیدۂ
بر ہر تنے سپاسِ روانے نہادۂ

دُنیا میں ہر فرد ایک مخصوص نظریۂ حیات کو دوست سمجھتا ہے۔ اور ہر فرقہ اس گمان میں مبتلا ہے کہ حقیقت اسی کے پاس ہے۔ افکار کی یہ گوناگونی تو نے خود ہی اپنے ذوقِ تنوع سے پیدا کی ہے کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْہِمْ فَرِحُون اگر تو چاہتا تو لوگوں کے خیالات میں یہ اختلافات نہ ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تنوع تجھے پسند ہے۔ ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوقؔ اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے (ذوقؔ)

مقطع میں اپنی نافہمی اور قدرنا اندیشی کا اقرار کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہتا ہے کہ میری زندگی بظاہر ویران معلوم ہوتی تھی اور میں اس ویرانی کو رونا روتا رہا۔ لیکن اس حقیقت سے غافل رہا کہ اس ویرانے اور خرابے میں معانی کا ایک خزانہ چھپا

ہُما تھا ؎

غالبؔ زغصہ مرد، ہماناخبرنداشت
کاندرخرابہ گنجِ نہانے نہادہ ام

جبرواختیار کی بحث دین ودانش کا ایک لاینحل مسئلہ ہے اور صحیح حکیمانہ اور اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ "الایمان بین الجبر والاختیار" تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں یہ بحث چھڑ گئی کہ انسان خدا کی مشیت کے ماتحت مجبورِ محض ہے۔ یا اسے اپنے اعمال پر کچھ اختیار بھی حاصل ہے۔ اگر جبرِ مطلق ہو تو دین اور اخلاق کی ساری تلقین بے معنی ہوجاتی ہے۔ ثواب و عذاب کا نظام بے حقیقت ہوجاتا ہے۔ انبیاء کی جدوجہد کے کچھ معنی نہیں رہتے۔ اعمال انسانی کے متعلق مدح و ذم کی کچھ بنیاد نہیں رہتی۔ دوسری طرف انسان کو اپنے اعمال کا مختارِ کل بھی نہیں سمجھ سکتے۔ جسم و نفس کی صلاحیتیں اس کی اپنی پیداوار نہیں ماحول کے اثرات اس کے اپنے آفریدہ نہیں۔ وہ ایک لامتناہی کل کا جزو ہے اور جزو کی ہستی کل سے متعین ہوتی ہے۔ لب لباب یہی ہے کہ

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

متکلمین میں کچھ جبری ہوگئے اور کچھ قدری اشاعرہ اور معتزلہ اس عقیدے پر جنگ آزما ہوگئے۔ کسی نے جبر کو درست سمجھا اور سراہا اور محمود شبستری کی طرح اسے عینِ دین سمجھا جیسا کہ وہ گلشنِ راز میں کہتا ہے ؎

ہر آنکس را کہ مذہب غیر جبر است
نبی فرمود کاو مانند گبر است

بعض نے عارف رومی کی طرح اختیار کو دین کی محکم اساس سمجھا۔ غالبؔ

ان دونوں راستوں سے ہٹ کر کہتا ہے کہ جبر بھی ایک بلا ہے اور اختیار بھی ایک بلا ان دونوں کے اندر فتنہ اور آزمائش ہے۔ انسان مجبور ہونے پر راضی نہیں اور اختیار سے وہ گنہگاری اور ظلم کرتا ہے۔ کہ خدا کی پناہ۔ زندگی میں کچھ آفتیں طوفان اور بھونچال اور طرح طرح کے حادثے فطرت کے لزوم اور جبر سے پیدا ہوتے ہیں اور کچھ مصیبتیں اور بلائیں ایسی ہوتی ہیں جو انسانی اختیار کے ناجائز استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی پر دونوں طرف سے برقِ فتنہ گر کر اس کے خرمنِ آرزو کو سوخت کرتی ہے۔ شاید کوئی ایسی سطحِ حیات بھی ہو جو جبر واختیار دونوں کے فتنوں سے بالاتر ہو لیکن یہ موجودہ زندگی تو ایسی نہیں۔ یہ دونوں قسم کی بجلیاں اس مشتِ خاک پر گرتی ہیں۔ جسے انسان کہتے ہیں۔

؎ دو برقِ فتنہ نہفتند در کفِ خاکے
بلائے جبر یکے رنجِ اختیار یکے
"قیامت مے دمد از پردۂ خاکے کہ انسان شد"

ستائشِ غم میں غالبؔ نے بے شمار اشعار کہے ہیں۔ بہت سے اشعار ہم اس فلسفۂ غم میں درج کر چکے ہیں۔ اس مضمون کا ایک شعر سنیے جو ایک حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔ ؎

غم راست بہ دل سوزی سعیٔ ادب آموزی
انداختگانش را اندازہ نشان استے

نشاط کے طالبوں کی زندگی میں ایک لاابالی پن اور ایک سطحیت ہوتی ہے لذت طلبی طبیعت میں کوئی توازن پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اکثر اکابر کی زندگی میں یہی ہوا ہے کہ نشاط طلبی کے دور میں وہ اسرارِ حیات سے بیگانہ رہے۔ لیکن کوئی

بڑا حادثہ اور بڑا غم ان کے لیے سرچشمۂ معرفت اور ادب آموز ہوگیا۔ زندگی صحیح راستے پر پڑ گئی۔ طبیعت میں حلم اور رحم پیدا ہوگیا۔ ہوسوں سے نجات مل گئی۔ تمام قوتیں بلند مقاصد کی طرف رجوع ہوگئیں۔ تمناؤں میں تناسب اور اندازہ سلامت روی کی طرف لے آیا۔

؎ غم راست بر دل سوزی سعیٔ ادب آموزی
اندا ختگانش را اندازہ نشان استے

ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند
تو کہ باشی کہ بخود زحمت کارے ندہی
پائے را خضر قدم سنجی کوئے نشوی
دوش را قدر گراں سنگی بارے ندہی
سر براو دم شمشیر جدا نے نشوی
تن بہ بند خم فتراک سوارے ندہی
چشمہ نوش ہمانا نتراود ز دلے
کش بگیری و در اندیشہ فشارے ندہی

اشعار بہت صاف اور ناصحانہ ہیں اور اس نصیحت کا ماخذ فہم آئینِ فطرت ہے۔ غالب کہتا ہے کہ یہ عالم عالمِ عمل ہے۔ اجرام فلکیہ ہوں یا زمین کے موالیدِ ثلاثہ ذرے سے آفتاب تک، ماہ سے ماہی تک، تحت الثریٰ سے ثریا تک، کوئی مخلوق ایسی نہیں جو مصروفِ عمل نہ ہو اور اپنا مخصوص وظیفۂ حیات پورا نہ کر رہی ہو۔ ایسی کائنات میں جس میں ہر ہستی کا قیام ہی عمل سے ہے تو کون ہوتا ہے جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور غفلت سے یا جھوٹی قناعت اور توکل سے عمل سے کنارہ کش

ہو سکے۔ ماہ و خورشید جنھیں تو جمادات میں شمار کرتا ہے وہ بھی اس جہانِ زمان و مکان میں بے کار نہیں۔ انسان جس کے لیے حیاتِ احسن کے اسباب فطرت نے مہیا کیے ہیں کیسی نافہمی اور ناشکری ہوگی کہ وہ ان سے کام نہ لے اور زندگی کے ممکنات کو پیرایۂ وجود نہ پہنائے۔ تجھے مردِ راہ بننا اور کسی بلند مقصود کی طرف گامزن ہونا چاہیے۔ منزلِ مقصود کی طرف قدم اٹھانے میں تو خود خضرِ راہ بن اور اپنے کندھوں پر فرائض کا بوجھ لاد کر ان کی قدر افزائی کر، فرائض سے سبکدوشی کوئی قدر و منزلت کی بات نہیں۔

کسی صاحب عزم اور جواں مرد کی شجاعت سے متاثر ہو کر تو کبھی سر دھڑ کی بازی کیوں نہیں لگاتا۔ کسی بلند حوصلہ شہسوار کے فتراک سے اپنے آپ کو کیوں نہیں باندھتا۔ زندگی ہر طرف سے نیش زن معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایسے قلب میں سے ایک چشمۂ نوش ابل پڑتا ہے جو افکار سے اسے فشار دے۔ اسی فشار سے قلب میں سے معرفت کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں۔ جو آخر میں کوثر و تسنیم بن جاتے ہیں۔ ان اشعار کا لبِ لباب یہ ہے کہ زندگی عمل اور تفکر سے ارتقا یاب ہوتی ہے۔ فکر و عمل سے گریز انسان کو جمادات سے بھی ادنیٰ بنا دیتی ہے۔ کیونکہ جمادات بھی اپنا وظیفۂ ہستی ادا کر رہے ہیں۔ نباتات و حیوانات بھی اپنی فطرت کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ تو بھی اپنی مخصوص فطرت کے مطابق عمل کر۔

در وجد بہ ہنجارِ نفس دست فشانیم
در حلقۂ ما رقصِ دف و عود نیابی

اکثر مذاہب نے آلاتی موسیقی کو داخل عبادت کر لیا ہے۔ اسلامی عبادت میں اس نے راہ نہیں پائی۔ خوش الحانی دلکش چیز ہے اور عبادت میں جو کچھ پڑھا جائے وہ خوش الحانی سے ہو تو زیادہ دل رس ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر چنگ و عود اور

وف و نے یا دیگر آلات موسیقی سے روحانیت کو بیدار کرنا ایمان میں کوئی ثبات پیدا نہیں کر سکتا۔ جذبات آفرینی کے لیے یہ ایک عارضی وسیلہ ہے۔ لیکن اس وسیلے کو لازم کر لینا کہ اس کے بغیر عبادت میں کوئی کیف ہی نہ پیدا ہو۔ قلب کو اصلی مقصود سے ہٹا دیتا ہے۔ سماع صوتی ہو یا آلاتی اس کے جواز یا عدم جواز پر صوفی اور غیر صوفی مسلمانوں نے بہت بحثیں کی ہیں۔ بعض صوفیہ دف و نے کا استعمال کرتے تھے اور بعض اس سہارے کو ضروری نہ سمجھتے تھے بلکہ اس میں خطرہ محسوس کرتے تھے کہ موسیقی کی لذت عبادت کی لذت کی جگہ نہ لے لے۔ غالب کہتا ہے کہ اگر وجد آئے اور اس میں دست افشانی اور پا کوبی ہو تو یہ نفس کی اپنی کیفیت سے پیدا ہونی چاہیے۔ جس وجد کی آفرینش مصنوعی وسیلوں سے ہوتی ہے وہ ایک عصبی اور عضوی کیفیت ہے۔ بعض گراں پایہ صوفی ذوق روحانی کی فراوانی سے رقص کرنے لگتے تھے۔ مریدوں نے اس رقص ہی کو شعار بنا لیا اور دف و نے کی لے پر رقص کرنا اپنا طریق عمل قرار دے لیا۔ حالانکہ ان کے اندر وہ چیز نہ تھی جو پیر میں رقص آفرین ہوتی تھی *

منتخب رباعیات

راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ
خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشاں ہا دارد
سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

عبد سے معبود تک ایک راستہ ہے۔ کسی کے لیے یہ راستہ دراز ہوتا ہے کسی کے لیے مقابلتہً چھوٹا۔ درازی راہ دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جو گمراہی سے پیدا ہوتی ہے۔ گمراہ انسان بھٹکتا ہوا گلیوں کے پیچ و خم میں راستہ بھول بھول کر اگر منزل پر کبھی پہنچتا بھی ہے تو بڑی دیر میں۔ اسی لیے مومن کو یہ حکم اور ہدایت ہے کہ وہ سیدھے راستے پر چلنے کی دعا کرتا رہے۔ صراطِ مستقیم پر چلنے کے باوجود ایک دوسری قسم کی درازی راہ ہے جس سے سالکان و عارفانِ خدا رس کو واسطہ پڑتا ہے وہ کسی منزل کو منزل نہیں سمجھتے اور خدا تک پہنچنے کے لیے ہر منزل کو نشانِ سرِ راہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا تصور بہت دور ہوتا ہے۔ یہ دوری گمراہی نہیں بلکہ عرفان سے پیدا ہوتی ہے۔

آثارِ جنت پر رک جانے اور وہیں مطمئن ہو کر ڈیرے ڈال دینے والے ہمت کی کوتاہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ راستے میں چشمہ اور سایہ پا کر تھوڑے عرصے تک دم لینا اور سستانا تو درست ہے لیکن اسے دلکش اور راحت آفریں پا کر وہیں رک جانا درست نہیں ؎ بڑھے جا زندگی ذوقِ سفر ہے

(اقبال)